غازی علم الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ

حضور نبی کریم ﷺ کی عزت و ناموس پر قربان ہوجانے والے نامور شہید محبت کی لازوال داستان جس کا مطالعہ آپ کے ایمان و ایقان کو ایک نئی زندگی اور آپ کی دینی غیرت وحمیت کو ایک نیا ولولہ تازہ عطا کرے گا۔

محمد متین خالد

غازی علم الدین شہیدؒ

حضور نبی کریم ﷺ کی عزت و ناموس پر قربان ہو جانے والے نامور شہید محبت کی لازوال داستان جس کا مطالعہ آپ کے ایمان و ایقان کو ایک نئی زندگی اور آپ کی دینی غیرت وحمیت کو ایک نیا ولولہ تازہ عطا کرے گا۔

محمد متین خالد

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت
ریلوے روڈ نزد تحصیل موڑ ننکانہ صاحب
✆:0300-8572511, 0300-4839384

انتساب

حکیم الامت، ترجمان حقیقت، مصور پاکستان حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے کہا تھا:

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

گزشتہ کئی سالوں سے مجاہد تحفظ ناموس رسالت غازی علم الدین شہیدؒ کے مزار پر ہر ماہ باقاعدگی سے حاضری میرا معمول ہے۔ میں وہاں تقسیم کرنے کے لیے اپنے ساتھ نئے کرنسی نوٹ اور مٹھائی بھی لے کر جاتا ہوں۔ ایک دن علی الصبح مزار پر حاضری ہوئی۔ نوافل، تلاوت قرآن مجید اور درود شریف ایصال ثواب کرنے کے بعد مزار کے باہر بیٹھے مستحقین میں پیسے اور مٹھائی تقسیم کی۔ اسی دوران میں نے دیکھا کہ دور سے ایک شخص جو بظاہر "جہاز" لگ رہا تھا، قمیص کے بٹن کھولے، فضا میں بازو لہراتے، بے حد اکڑ اور غرور کی چال چلتے ہوئے مزار کی طرف آ رہا ہے۔ جونہی وہ غازی صاحب کے مزار کے قریب آیا، فوراً ادب و احترام کی تصویر بن کر رک گیا۔ اس نے جلدی سے گریبان اور کف کے بٹن بند کیے، جیب سے چھوٹا سا کپڑا نکال کر سر پر رکھا اور گردن جھکا کر نہایت مؤدبانہ انداز میں صاحب مزار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "غازی بادشاہ! تسیں بڑا کمال کم کیتا اے، اللہ دی قسمے، اگر تسیں ایہ کم نہ کردے تے میں ضرور کردا"۔ میں نے اس کی زبانی یہ ایمان افروز الفاظ سنے تو حیرت و استعجاب کے سمندر میں ڈوب گیا اور بے اختیار آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اسی کیفیت میں، میں نے اسے تمام رقم اور مٹھائی دے دی اور سسکیوں میں بمشکل اس کا نام پوچھ سکا تو اس نے کہا: "بھولا"۔ تھوڑی دیر تک مجھ پر بے خودی کی کیفیت طاری رہی، حواس بحال ہوئے تو باہر مین روڈ تک اس کے پیچھے بھاگا تا کہ اس کی دست بوسی کر سکوں مگر وہ عاشق رسولؐ غائب ہو چکا تھا۔ آج جب بھی غازی صاحب کے مزار پر حاضری ہوتی ہے تو آنکھیں خود بخود اسے تلاش کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ میں اس چھوٹی سی کتاب کا انتساب "بھولے" کے نام کرتے ہوئے عجیب روحانی خوشی محسوس کر رہا ہوں۔

مستانوں کی ہوشیاری دیکھو، مدہوشی سے کیا کام لیا
منہ پھیر کے ساری دنیا سے، سرکار ﷺ کا دامن تھام لیا

یہ پمفلٹ غرقاب عشق رسولؐ، محبّ اہلبیتؓ وصحابہ کرامؓ جناب انجینئر مدثر حسین چودھری (منڈی بہاؤالدین) نے شائع کروایا۔ اللہ رب العزت انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

بنیادی طور پر ہر مسلمان کو حضور رحمت للعالمین، شفیع المذنبین، خاتم النبیین، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے والہانہ عقیدت ومحبت واحترام ہے۔ وہ آپ ﷺ کی ذات اقدس پر اپنی جان قربان کرنا موجب نجاتِ اُخروی اور شہادت ایسے بلند مرتبے پر فائز ہونے کو باعث صد افتخار سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے:

- اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (احزاب:6)

''یعنی مسلمانوں کو حضور نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی اپنی جانوں سے زیادہ مقدم ہے اور ادب وتعظیم کے لحاظ سے رسالت مآب ﷺ کی ازواج مطہرات مسلمانوں کی مائیں ہیں۔''

ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرطِ عقیدت ومحبت کی وجہ سے فرمایا:

- ''مجھے حضرت محمد ﷺ، خود اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ عزیز ہیں کیونکہ آپ ﷺ کی ذات بابرکات نے ہی مجھے اللہ جل جلالہٗ سے متعارف کرایا ہے''۔

اسی مضمون کو حکیم الامت حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے یوں ادا کیا ہے:

معنیٔ حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیق اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبی ﷺ
از خدا محبوب تر گردد نبی ﷺ

یعنی اگر تو میری بات کو سمجھے اور اس فلسفے پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی آنکھوں سے نظر ڈالے تو دل اور جگر کی تمام قوتیں حضور نبی کریم ﷺ پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں اور آپ ﷺ کی ذات گرامی خود اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ محبوب ہو جاتی ہے۔

حضور رحمت عالم ﷺ کے بہت سے جلیل القدر صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کی حرمت پر قربان ہوئے اور بعض عظمت اسلام کا پرچم بلند کرتے ہوئے شہادت کے جام نوش کرتے رہے۔ یہ وہ عظیم ہستیاں ہیں جنہیں آپ ﷺ کی بابرکت صحبت میسر تھی۔ لیکن شمع رسالت ﷺ کے اُن پروانوں کی شہادت کا درجہ کیا ہوگا جو صدیوں بعد محض آپ ﷺ کا مبارک تذکرہ سن کر

آپ ﷺ کی عزت و ناموس پر قربان ہو جائیں..... غازی علم الدین شہیدؒ بھی اسی شاہراہ جناں کا ایک مسافر ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہماری حالیہ تاریخ میں قافلہ جاں نثاران حرمت رسول ﷺ کے سردار غازی علم الدین شہید ہی ہیں۔ پاکستان کے دل لاہور کے وسط میں نئی انارکلی سے متصل ہسپتال روڈ پر ''راجپال اینڈ سنز'' کے نام سے ایک ہندو مہاشے راجپال کی کتابوں کی دکان تھی۔ اس دکان میں اکثر کتب ہندو دھرم سے متعلق ہوتی تھیں اور بعض کتب وہ خود بھی شائع کرتا تھا۔ راجپال کے دوستوں اور اس کی دکان پر آنے جانے والوں کی اکثریت ہندو متعصبین کی تھی۔ گزشتہ صدی کے آخری ربع میں ہندوؤں میں خواہ مخواہ مسلم دشمنی کا مرض عود کر آیا اور انہوں نے دین اسلام پر ریکیک حملے شروع کر دیے۔ ہندوؤں نے اسلام کی مقدس شخصیات کی شان میں کذب و افترا اور دریدہ دہنی کے ایسے شرمناک مظاہرے کیے جن سے مسلم دل و دماغ میں غم و اضطراب کی آندھیاں چلنے لگیں۔ علاوہ ازیں وہ شدھی اور سنگھٹن جیسی بدنام زمانہ اسلام دشمن تحاریک کے ذریعے مسلمانوں کے قلب و جگر چھلنی کر رہے تھے۔ اسی دوران راجپال پبلشر نے ایک بڑی دلخراش جسارت کرتے ہوئے ہمارے ہادی برحق، فخر موجودات، حضور سرور کائنات ﷺ (فداہ ابی و امی) پر انتہائی گستاخانہ اور دل آزار کتاب شائع کر دی جس سے ملت اسلامیہ کا لہو کھولنے لگا اور انہوں نے راجپال سے کہا کہ وہ ہزلیات پر مشتمل اپنی اس کتاب کو تلف کر دے مگر آریہ سماج لیڈران سے گہرا تعلق ہونے کی بنا پر اس نے نہ صرف مسلمانوں کا یہ مطالبہ یکسر نظر انداز کر دیا بلکہ اس گستاخانہ کتاب کا سستا ایڈیشن شائع کرنے کا بھی اعلان کر دیا۔ اس پر ملت اسلامیہ میں اضطراب و ہیجان اور شدید غم و غصہ کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ جب یہ فساد مزید بڑھا تو حکومت برطانیہ نے کتاب کی ضبطی کے ساتھ شہر میں دفعہ 144 کا نفاذ کر کے ہر قسم کے جلسے جلوسوں پر پابندی لگا دی۔ بعدازاں مسلمانوں کے شدید احتجاج پر حکومت نے ناشر کے خلاف فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے الزام میں دفعہ 153 الف کے تحت مقدمہ درج کر کے راجپال کو گرفتار کر لیا۔

24 مئی 1924ء کو لاہور کے ایک مجسٹریٹ سی ایچ ڈرنی کی عدالت میں اس کیس کی سماعت ہوئی۔ عدالت میں ممتاز ہندو وکلاء نے راجپال کا دفاع کیا۔ طویل سماعت کے بعد 1924ء کے آخر میں عدالت نے راجپال کو چھ ماہ قید بامشقت اور ایک ہزار روپے جرمانے کی

سزا کا حکم سنایا۔ راجپال نے اس فیصلے کے خلاف سیشن کورٹ میں اپیل کر دی۔ یہ اپیل کرنل ایف سی نکولس نے سنی اور اس نے راجپال کی سزا میں نصف تخفیف کر دی۔ بعد ازاں ملزم کی طرف سے نگرانی کی ایک درخواست ہائی کورٹ میں پیش ہوئی جس کی سماعت کنور دلیپ سنگھ کی عدالت میں ہوئی۔ اس وقت پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر شادی لال تھے جن کی ذاتی سفارش پر راجپال رہا ہو گیا۔ جسٹس کنور دلیپ سنگھ کے فیصلے پر مسلمانوں میں طیش کی شدید لہر دوڑ گئی۔ اس فیصلہ کے خلاف شہر بھر میں جلسے جلوس ہوئے اور بہت ساری گرفتاریاں بھی ہوئیں۔

مسلمانوں میں راجپال کے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے یعنی اس کے بری ہونے پر شدید غم و غصہ اور بے چینی تھی کہ 26 ستمبر 1927ء کو ایک غیور مسلمان خدا بخش نے شاتم رسول راجپال پر قاتلانہ حملہ کیا۔ یہ حملہ دن کے وقت اس کی دکان پر چاقو سے کیا گیا جس سے راجپال زخمی تو ضرور ہوا مگر واصل جہنم نہ ہو سکا۔ شاید یہ سعادت، قدرت نے کسی اور کے لیے رکھی تھی۔ حملہ کرنے والا غازی خدا بخش ولد محمد اکبر ایک کشمیری خاندان سے تھا۔ یکی گیٹ لاہور کا رہنے والا تھا۔ یہ دودھ فروش بھی تھا اور جلد ساز بھی۔ اس کا دل نورِ ایمان سے منور تھا۔ اس نے جمعہ کو ایک مقامی مسجد میں تحفظ ناموس رسالت ﷺ پر تقریر سنی اور راجپال کا کام تمام کرنے کے لیے بے قرار ہو گیا تھا۔ بعد ازاں غازی خدا بخش گرفتار ہوا، کیس چلا اور اسے سات سال قید بامشقت کا حکم سنایا گیا۔ اس فیصلے سے ہندو تو قدرے مطمئن ہو گئے، راجپال بھی ٹھیک ہو گیا مگر اہل اسلام کے دلوں میں نیا جوش پیدا ہوا اور وہ پھر سے اس شاتم رسول کو از خود سزا دینے کی منصوبہ بندی کرنے لگے۔

راجپال کی ناپاک جسارت کے چرچے دور دور تک پھیل چکے تھے۔ چنانچہ شمع رسالت ﷺ کے ایک پروانے نے افغانستان میں ملعون راجپال کی شائع کردہ گستاخانہ کتاب کا تذکرہ سنا تو اس کا خون بھی کھولنے لگا۔ کابل کے اس غیور پٹھان کا نام عبدالعزیز تھا۔ ایک روز وہ مسلسل تلاش کے بعد انارکلی کی جانب سے مہاشہ راجپال کی دکان پر پہنچا۔ وہاں ایک ہندو ستیانند کو راجپال سمجھ کر اُس پر چاقو سے حملہ کر دیا جس سے وہ شدید زخمی ہو گیا۔ غازی عبدالعزیز کا مقدمہ 11 اکتوبر 1927ء کو مسٹر اوگلو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا اور 12 اکتوبر 1927ء کو سرسری سماعت کے بعد عدالت نے اسے 14 سال کی قید بامشقت سنا دی۔

حرمت رسول ﷺ کے ناپاک مجرم راجپال کو کیفر کردار تک پہنچانے کی سعادت

اسلام کے سرفروش مجاہد غازی علم الدین شہید کے حصے میں آنے والی تھی۔ غازی علم الدین 4 دسمبر 1908ء کو محلہ چابک سواراں المعروف سرفروشاں (سریانوالہ بازار) لاہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے لیے آپ کو 6 سال کی عمر میں تکیہ سادھواں کی مسجد میں بٹھا دیا گیا، بعد ازاں انہیں اس مسجد سے بازار نوہریاں اندرون اکبری دروازہ بابا کالو کے مکتب کا طالب علم بنا دیا گیا لیکن وہ ابتدائی تعلیم سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ان کے والد طالع مند اپنی روٹی روزی کے لیے لکڑی کے کام سے منسلک تھے۔ اسی لیے غازی صاحب نے بھی مستری نظام دین سے جو بھاٹی دروازہ کے اندر رہا کرتے تھے، اپنا آبائی پیشہ سیکھنا شروع کر دیا۔ آپ نے یہاں صرف چند ماہ ہی کام سیکھا، پھر آپ نے اپنے والد اور بڑے بھائی محمد دین سے نجاری کے کام میں خوب مہارت حاصل کی۔

غازی علم الدین کے والد میاں طالع مند ماہر ہنر مند تھے۔ انہوں نے 1911ء میں میر عثمان علی خاں نظام دکن کی دہلی والی کوٹھی میں کام کیا اور اپنے اچھے اور معیاری کام کی وجہ سے خود نظام کے دستخطوں سے حسن کارکردگی کی سند پائی۔ جن دنوں آریہ سماج کی پرفتن ایذا رسانیاں عروج پر تھیں، میاں طالع مند نے کوہاٹ ریلوے اسٹیشن پر کام کا ٹھیکہ لیا ہوا تھا۔ وہ اپنے نورِ نظر علم الدین کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ علم دین باقاعدگی سے ورزش کرتے اور اپنی بہتر صحت کی وجہ سے اپنی عمر سے زیادہ تنومند اور خوبصورت نوجوان نظر آتے تھے۔ آپ سڈول جسم، سرخ و سفید رنگت، چوڑی پیشانی اور سیاہ و گھنگریالے بالوں کے مالک تھے۔ مارچ 1929ء میں علم دین کے بڑے بھائی محمد دین کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تو آپ نومولود بھتیجی کو دیکھنے لاہور آئے تو اس موقع پر آپ کی منگنی آپ کے ماموں سراج الدین کی دختر فاطمہ بی بی سے ہوگئی۔

یکم اپریل 1929ء کی رات غازی علم الدین شہید اپنے بڑے بھائی محمد دین کے ساتھ دہلی دروازہ کے قریب جلسہ سننے چلے گئے، جہاں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے بڑی پرجوش تقریر کی۔ دفعہ 144 کا نفاذ تھا جس کی رو سے کسی نوع کا جلسہ یا اجتماع نہیں ہو سکتا تھا لیکن مسلمانوں کا ایک فقید المثال اجتماع بیرون دہلی دروازہ درگاہ شاہ محمد غوثؒ کے احاطہ میں منعقد ہوا۔ وہاں اس بطلِ حریت نے ناموسِ رسالت ﷺ پر جو تقریر کی، وہ اتنی دل گداز اور پرسوز تھی کہ سامعین پر رقت طاری ہوگئی۔ کچھ لوگ تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ شاہ جیؒ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

❑ ''مسلمانو! میں تمہاری سوئی ہوئی غیرت کو جھنجھوڑنے آیا ہوں۔ آج کفار نے توہین

رسالت ﷺ کا فیصلہ کرلیا ہے۔ انھیں شاید یہ غلط فہمی ہے کہ مسلمان مر چکا ہے۔ آؤ اپنی زندگی کا ثبوت دو۔ عزیز نوجوانو! تمھارے دامن کے سارے داغ صاف ہونے کا وقت آ پہنچا ہے۔ گنبد خضریٰ کے مکین تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ ان کی آبرو خطرے میں ہے۔ ان کی عزت پر کتے بھونک رہے ہیں۔ اگر قیامت کے روز حضرت محمد ﷺ کی شفاعت کے طالب ہو تو پھر توہین رسالت ﷺ کرنے والی زبان نہ رہے یا پھر سننے والے کان نہ رہیں"۔

مشہور ادیب ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ اس روز پانی اور آگ یعنی سرد آہوں اور گرم آنسوؤں کے ملاپ سے ان کی تقریر ڈھل رہی تھی۔ شاہ جیؒ نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

❑ "آج آپ لوگ جناب فخر رسل رسول عربی ﷺ کی عزت و ناموس کو برقرار رکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ آج اس جلیل القدر ہستی کی عزت معرض خطر میں ہے جس کی دی ہوئی عزت پر تمام موجودات کو ناز ہے۔ آج کوئی روحانیت کی آنکھ سے دیکھنے والا ہو تو دیکھ سکتا ہے کہ اس دروازے پر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ آئیں اور فرمایا کہ ہم تمہاری مائیں ہیں۔ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ کفار نے ہمیں گالیاں دی ہیں؟" ارے دیکھو! کہیں ام المومنین عائشہؓ دروازے پر تو نہیں کھڑی ہیں؟ (یہ سن کر مجمع پلٹا کھا گیا۔ مسلمانوں میں کہرام مچ گیا اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے) تمہاری محبت کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالتوں میں کٹ مرتے ہو لیکن کیا تمھیں معلوم نہیں کہ آج سبز گنبد میں رسول اللہ ﷺ تڑپ رہے ہیں۔ آج خدیجہؓ اور عائشہؓ پریشان ہیں۔ بتاؤ تمھارے دلوں میں امہات المومنینؓ کی کیا وقعت ہے؟ آج ام المومنین عائشہؓ تم سے اپنے حق کا مطالبہ کر رہی ہے۔ وہی عائشہؓ جنھیں رسول اللہ ﷺ حمیرا کہہ کر پکارتے تھے۔ جنھوں نے سید عالم ﷺ کی رحلت کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔ اگر تم خدیجہؓ اور عائشہؓ کی ناموس کے تحفظ کی خاطر جانیں دے دو گے تو کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے۔ یاد رکھو! جس روز یہ موت آئے گی، پیام حیات لے کر آئے گی۔ اگر کچھ پاس رسالت ﷺ ہے تو ناموس رسالت ﷺ کی حفاظت کرو"۔

شاہ جی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:

❑ "جب تک ایک مسلمان بھی زندہ ہے، ناموس رسالت پر حملہ کرنے والے چین سے نہیں رہ سکتے۔ پولیس جھوٹی، حکومت کوڑھی اور ڈپٹی کمشنر نااہل ہے۔ وہ ہندو اخبارات کی ہرزہ سرائی تو روک نہیں سکتا، لیکن علمائے کرام کی تقریریں روکنا چاہتا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ دفعہ 144 کے

یہیں پر نچے اڑا دیے جائیں۔ میں دفعہ 144 کو اپنے جوتے کی نوک تلے مسل کر بتا دوں گا۔

پڑا فلک کو دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے راکھ نہ کر دوں تو داغ نام نہیں"

داغ کا یہ شعر شاہ جی نے کچھ اس انداز سے پڑھا کہ لوگ بے قابو ہو گئے۔ اس تقریر نے مسلمانوں کی ایمانی غیرت وحمیت کو نئی جلا بخشی۔ لاہور میں بدنام زمانہ کتاب، اس کے مصنف اور ناشر کے خلاف جا بجا جلسے ہونے لگے۔ اس جلسہ کے چند روز بعد سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، غازی عبدالرحمٰن اور مولانا حبیب الرحمٰن گرفتار کر لیے گئے۔ ان پر امن عامہ میں خلل ڈالنے کا مقدمہ بنا۔ اس کے علاوہ بھی سیکڑوں مسلمانوں کی گرفتاریاں ہوتی رہیں کیونکہ جب تک وہ اشتعال انگیز کتاب موجود تھی، مسلمانوں کے انتقامی شعلوں کا سرد ہونا ناممکن تھا۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے پرجوش اور ایمان افروز کلمات اہل ایمان کے دلوں کی دھڑکنوں میں ڈھل گئے۔ اس کے علاوہ مسلمان علماء ومشائخ بالخصوص حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہؒ، مولانا ظفر علی خانؒ، علامہ اقبالؒ اور دوسرے مسلم زعماء نے مسلمانوں کے اندر عشق رسول ﷺ کی لافانی محبت کو دوچند کر دیا اور برصغیر کے کونے کونے سے گستاخ رسول راجپال کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ ہونے لگا۔

شاہ جیؒ کی تقریر سننے کے بعد غازی علم الدین شہیدؒ کی کیفیت عجیب سی ہو گئی تھی۔ آپ کے ذہن میں ہمہ وقت شاہ جیؒ کی ایمان افروز تقریر کے شعلہ بیاں الفاظ گونجتے رہتے۔ ایک رات غازی علم الدین شہیدؒ نے خواب میں نہایت نورانی شکل وصورت والے بزرگ کو دیکھا جنھوں نے غازی صاحب سے کہا:

"علم الدین اُٹھو اور جا کر گستاخ رسول ملعون راجپال کا قصہ تمام کر دو"۔

علم الدین ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور آپ کا تمام جسم پسینے میں شرابور تھا۔ آپ پریشانی کی حالت میں منہ اندھیرے ہی گھر سے نکلے اور اپنے دوست شیدے کے گھر جا پہنچے۔ پھر اسے ساتھ لیے بھاٹی چوک کی طرف نکلے۔ وہاں جب شیدے کو یہ خواب سنایا تو وہ پھٹی پھٹی نظروں سے آپ کی طرف دیکھنے لگا۔ آپ کے دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ "یہ خواب میں نے بھی دیکھا ہے۔" آپ بولے کہ "پہلے خواب میں نے دیکھا ہے، اس لیے پہلے عمل بھی میرا ہی ہوگا۔ راجپال کی زندگی کا خاتمہ میرے ہاتھوں ہی ہوگا۔" شیدے نے اعتراض کیا تو

علم الدین نے کہا ''ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اٹھے اور کاغذ کے دو ٹکڑے اٹھا لائے۔ ایک ٹکڑا شیدے کو دیا، ایک اپنے پاس رکھا اور شیدے کو اپنے کاغذ کے ٹکڑے پر نشان لگانے کو کہا۔ کچھ دیر بعد دونوں نے نشان لگا کر کاغذ کے ٹکڑے زمین پر پھینک دیے اور اسی میدان میں کھیلتے ہوئے ایک بچے کو بلا کر پرچی اٹھانے کو کہا۔ بچے نے جو پرچی اٹھائی، اس پر علم الدین کا نام تھا۔ یہ جان کر وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ ''علم الدین اس طرح نہیں، ایک بار پھر پرچی پھینکو۔'' شیدے نے کہا۔ علم الدین نے ایک بار پھر پرچیاں پھینکیں تو پھر آپ کا نام نکل آیا۔ اس وقت شیدے کا چہرہ بالکل مرجھایا ہوا تھا۔ ''علم الدین دو دفعہ تمہارا نام نکلا ہے صرف ایک بار اور.....'' ''نہیں شیدے اب نہیں..... فیصلہ ہو گیا ہے۔'' علم الدین نے کہا تو شیدے نے ان کی منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔ ''علم الدین..... صرف ایک بار پھر پرچی پھینکو..... اب کی بار اگر تمہارا نام نکلا تو تمہاری قسمت۔'' ''ٹھیک ہے۔'' اتنا کہتے ہوئے علم الدین نے دونوں پرچیاں دوبارہ پھینکیں۔ جب بچے نے دوبارہ پرچی اٹھائی تو جو نام نکلا وہ پھر علم الدین ہی کا تھا۔ علم الدین کا چہرہ اس جیت کی خوشی سے سرخ ہو گیا تھا اور شیدہ افسردہ حالت میں آپ کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں وہاں سے چل دیے۔

آپ نے 5 اپریل کو دوبارہ اپنے بھائی سے اسی موضوع پر گفتگو کی۔ بھائی نے بتایا کہ ''سوامی دیانند'' کا شاگرد ''مہاشہ کرشن'' ہے جو روزنامہ ''پرتاب'' کا مدیر ہے۔ اس نے یہ گستاخانہ کتاب لکھی جس میں رسول پاک ﷺ کی بدترین توہین کی گئی ہے، مگر ڈرپوک اتنا ہے کہ مسلمانوں کے غم و غصہ سے بچنے کے لیے ''پنڈت چموپتی'' کا فرضی نام بطور مصنف لکھ دیا۔ مگر جس شخص نے یہ کتاب چھاپی ہے، اس نے اپنا مکمل پتہ اور نام، کتاب پر درج کیا ہے۔ غازی علم الدین شہیدؒ نے اپنے بھائی سے دوبارہ اس دکان کا راستہ معلوم کیا جہاں راجپال بیٹھتا تھا۔ آپ نے اپنے بھائی سے یہ بھی پوچھا: ''اگر میں راجپال موذی کو واصل جہنم کر دوں تو کیا ہو گا؟'' آپ کے بھائی نے جواب دیا: ''حضور شافع محشر حضرت محمد ﷺ آپ سے راضی ہوں گے اور آپ شہید ہو کر جنت الفردوس میں جائیں گے۔''

چنانچہ 6 اپریل 1929ء کو غازی علم الدین شہیدؒ نے صبح صاف ستھرا لباس زیب تن کیا۔ خوشبو لگائی اور سر پر گلابی رنگ کا رومال رکھا۔ اُس دن آپ نے اپنی والدہ سے اپنی پسند کا کھانا بنوایا۔ بھابھی کے ہاتھ کے بنے ہوئے چاول کھائے۔ اور والدہ صاحبہ سے چار آنے

وصول کیے، حالانکہ اس سے پہلے وہ صرف ایک آنہ وصول کرتے تھے۔

چار آنے وصول کر کے خوشی خوشی گھر سے نکلے اور لنڈا بازار جا کر لوہا بازار سے 13 انچ لمبی خنجر نما چھری خریدی اور اس کی تیز دھار کو پرکھا۔ یاد رہے کہ لوہا بازار اس زمانے میں ''آتما کباڑیے'' کی دکان کے نام سے مشہور تھا۔ آپ نے چھری کو ڈب میں رکھا۔ نشۂ شہادت میں سرمست ہو کر راج پال کی دکان کی طرف چل دیے۔ دل میں عقیدت کے گلاب کھِل رہے تھے۔ غازی علم الدین شہیدؒ ناموسِ مصطفیٰ ﷺ کی پاسداری کا جذبہ عظیم اپنے دل و دماغ میں سجائے ملعون راج پال کی دکان پر پہنچے۔ انارکلی میں ہسپتال روڈ پر عشرت پبلشنگ ہاؤس کے سامنے ہی راج پال کا دفتر تھا جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ راج پال کچھ دیر پہلے مذکورہ بالا کتاب چھاپنے کے سلسلے میں مقدمہ سے بری ہوا تھا۔ اس وقت دفعہ 295 سی تعزیراتِ ہند میں شامل نہ تھی۔ صرف فرقہ ورانہ فسادات پھیلانے کی دفعہ 295 قانون میں شامل تھی۔

تقریباً ایک بجے دن کا وقت تھا کہ آپ وہاں پہنچے ہی تھے کہ راج پال بھی اپنی کار میں وہاں آ پہنچا۔ راجپال کو دیکھتے ہی غازی علم الدین کی آنکھوں میں خون اتر آیا، اور پھر ان کی قوتِ سماعت سے وہی الفاظ ٹکرائے:

''علم الدین اُٹھو اور جا کر گستاخ رسول ملعون راجپال کا قصہ تمام کر دو''۔

راجپال اس وقت ''ہری دوار'' سے واپس آ رہا تھا۔ وہ دفتر میں جا کر اپنی کرسی پر بیٹھا اور پولیس کو اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے فون کرنے کی سوچ رہا تھا کہ اتنے میں غازی علم الدین دفتر میں داخل ہوئے۔ اس وقت راج پال کے دو ملازم بھی وہاں موجود تھے۔ ''کدار ناتھ'' پچھلے کمرے میں کتابیں رکھ رہا تھا جبکہ ''بھگت رام'' راجپال کے پاس ہی کھڑا تھا۔ راجپال نے درمیانے قد کے گندمی رنگ والے جوان کو دفتر میں آتے دیکھا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ موت اس کے اتنا قریب آ چکی ہے۔ علم الدین نے ابھی راجپال کو صحیح طرح پہچانا نہیں تھا۔ چنانچہ آپ نے پوچھا: ''راجپال کون ہے؟'' راجپال سہم سا گیا اور کہا، ''میں ہی راجپال ہوں، کیا کوئی کام ہے؟'' آپ نے بجلی کی تیزی سے چھری نکالی اور پوری قوت کے ساتھ اس کے سینے میں گھونپتے ہوئے کہا: ''بس یہی کام تھا۔'' یوں آپ نے ملعون راجپال کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور اس بدبخت کے منہ سے صرف ''ہائے'' ہی نکل سکا۔ راجپال کے سینے سے خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے کہ اتنے میں شور بلند ہوا:

''ایک مسلمان نے راجپال کو قتل کر دیا ہے۔ قاتل خون آلود چھرا لہراتا ہوا مشرق کی جانب چلا گیا ہے۔ پکڑو۔ پکڑو.....''

اسی اثنا میں مشتعل ہندوؤں نے راہ گزرتے ایک بے گناہ مسلمان فتح محمد کو پکڑ لیا اور اسے شدید زدوکوب کیا۔ غازی علم الدین، ملعون راجپال کو قتل کرنے کے بعد بڑے سکون کے ساتھ ہسپتال روڈ سے ہوتے ہوئے حضرت قطب الدین ایبکؒ کے مزار کے قریب لکڑیوں کے ٹال پر پانی کے نل سے اپنے ہاتھ اور کپڑوں سے خون کے نشانات صاف کرنے لگے۔ اچانک انہیں خیال آیا کہ کہیں وہ ملعون زندہ ہی نہ ہو۔ چنانچہ آپ بجلی کی سی تیزی سے فوراً دوبارہ راجپال کی دکان پر آئے اور غصے سے پریس میں پڑی ہوئی ایک مشین راجپال پر دے ماری۔ اس پر ''ستیارام سوداگر چوب'' کے بیٹے ''ودیانند'' اور دیگر ہندوؤں نے آپ کو پکڑ لیا جو شور سن کر باہر نکلے تھے۔ اسی دوران راجپال کے ملازم کدارناتھ نے آپ کو پہچان لیا اور شور مچا دیا کہ یہی اصل ملزم ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد نے آپ کو قابو کر لیا۔ اس موقع پر جب غازی علم الدین کو علم ہوا کہ ملعون راجپال قتل ہو چکا ہے تو آپ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا: ''خدا کا شکر ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی کیونکہ میں نے صبح گھر سے نکلتے وقت دعا مانگی تھی کہ یا اللہ! یہ سعادت آج تو مجھے ہی بخش دے''۔ اسی دوران پولیس آ گئی جس نے غازی صاحب کو گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے وقت غازی صاحب نے سفید رنگ کی نہایت خوبصورت شلوار قمیص زیب تن کی ہوئی تھی۔ ان کے سر پر گلابی رنگ کا رومال اور ایک فاتح کی طرح چہرے پر نہایت اطمینانیت اور سکون نمایاں تھا۔

لاہور کے گلی کوچوں میں راجپال کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ''راجپال اینڈ سنز'' کے مقتل کی طرف ہندو اُمڈے چلے آ رہے تھے۔ اس واقعہ کے بعد سارے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ شہر بھر کے ہندو سہم گئے۔ ہندو مسلم کشیدگی پر قابو پانے کے لیے لاہور میں دفعہ 144 کا نفاذ کر دیا گیا۔ رات تک راجپال کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور صبح سویرے ہندوؤں کا ایک ہجوم میو ہسپتال کے اردگرد اکٹھا ہو گیا۔ پورا مجمع ہندو دھرم کی جے اور ویدک دھرم کی جے کے نعرے بلند کر رہا تھا۔ وہ بھجن گا کر جلوس کو شہر میں سے گزارنے کا مطالبہ کر رہے تھے لیکن ضلعی حکام ہندو مسلم فساد کا خطرہ مول لینے سے گریزاں تھے، اس لیے وہ ہجوم کا مطالبہ مان کر نئے مسائل میں نہیں اُلجھنا چاہتے تھے۔ بالآخر ضلعی حکام نے

راجپال کی دھرم پتنی (بیوہ) سرسوتی دیوی کی طرف سے پرامن رہنے کی یقین دہانی کرانے پر لاش ورثا کے حوالے کر دی۔ راجپال کی نعش کو مہاتما ہنسراج جی نے آگ لگائی، پھر اس کی راکھ کو راوی کی تند و تیز موجوں کے سپرد کر دیا گیا۔

راجپال کے ایک ملازم کدار ناتھ نے اس قتل کی ایف آئی آر انارکلی تھانہ میں درج کرائی تھی جبکہ غازی علم دین کو پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پولیس نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے تفتیش کا دائرہ کار وسیع کر دیا تھا جس کی وجہ سے دوران تفتیش غازی علم دین کے گھر کی ہر چیز توڑ پھوڑ کر ضائع کر دی گئی۔ غازی علم دین کے والد طالع مند کو حکومت کی ناجائز سختیوں سے دو چار ہونا پڑا۔ پولیس میں اکثریت سکھوں کی تھی، انہوں نے غازی صاحب کے اہل خانہ سمیت قریبی رشتہ داروں کو بے حد ذہنی اذیت دی۔ پولیس نے غازی علم دین کے بڑے بھائی محمد دین کو دہلی گیٹ لاہور کے قریب سے گرفتار کیا حالانکہ اُن کا اس واقعہ سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔

راجپال کے قتل کے بعد ہندو اخبارات و جرائد کا رویہ انتہائی متشددانہ اور دلآزار ہو گیا تھا۔ بیہودہ اداریے، مبالغہ انگیز خبریں اور غلط سلط مضامین جن میں کہا جاتا کہ ایک نہیں ہزاروں راجپال پیدا ہوں گے، ایک نہیں ہزاروں ایسی کتابیں لکھی جائیں گے۔ اس ضمن میں ہندو اخبارات ملاپ، پرتاپ، بندے ماترم وغیرہ راجپال ایسے ناپاک ذرے کو آفتاب سے تشبیہ دینے میں سفید کاغذ سیاہ کر رہے تھے۔

اسی دوران قادیانی جماعت کے بانی آنجہانی مرزا قادیانی کے بڑے بیٹے اور قادیانی جماعت کے دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین نے غازی علم الدین شہیدؒ کے سنہرے کارنامے پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا:

□ ''اسی طرح اس قوم کا جس کے جوشیلے آدمی قتل کرتے ہیں، خواہ انبیاء کی توہین کی وجہ سے ہی وہ ایسا کریں، فرض ہے کہ پورے زور کے ساتھ ایسے لوگوں کو دبائے اور ان سے اظہار برأت کرے۔ انبیاء کی عزت کی حفاظت قانون شکنی کے ذریعہ نہیں ہو سکتی، وہ نبی کیا نبی ہے جس کی عزت کو بچانے کے لیے خون سے ہاتھ رنگنا پڑیں۔ جس کے بچانے کے لیے اپنا دین تباہ کرنا پڑے۔ یہ سمجھنا کہ محمد رسول اللہ کی عزت کے لیے قتل کرنا جائز ہے، سخت نادانی.....

وہ لوگ (غازی علم الدین شہید، ناقل) جو قانون کو ہاتھ میں لیتے ہیں وہ بھی مجرم ہیں اور اپنی قوم کے دشمن ہیں اور جو ان کی پیٹھ ٹھونکتا ہے، وہ بھی قوم کا دشمن ہے۔ میرے

نزدیک تو اگر یہی شخص (راجپال کا) قاتل ہے جو گرفتار ہوا ہے تو اس کا سب سے بڑا خیر خواہ وہی ہو سکتا ہے جو اس کے پاس جاوے اور اسے سمجھائے کہ دنیاوی سزا تو تمہیں اب ملے گی ہی، لیکن قبل اس کے کہ وہ ملے، تمہیں چاہیے خدا سے صلح کر لو۔ اس کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ اسے بتایا جائے کہ تم سے غلطی ہوئی ہے۔'' (خطبہ جمعہ میاں محمود احمد خلیفہ قادیان مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد 16 نمبر 82 ص 7-8 مورخہ 19/اپریل 1929ء)

اس قبیل کا دوسرا فتنہ پرور بھارتی نژاد متنازعہ مصنف وحید الدین خان، غازی علم الدین شہیدؒ کی توہین و تضحیک کرتے ہوئے لکھتا ہے:

❑ ''اگر ناموس رسول کی حفاظت کا طریقہ یہی ہو جو غازی علم الدین نے اختیار کیا تو یقیناً یہ مقصد حاصل نہیں ہوا، کیوں کہ اس قتل کے بعد شردھانند نے اس ملک کی اکثریت کے درمیان قومی ہیرو کی حیثیت اختیار کر لی۔ ملک کی تاریخ میں ان کو ''شہید'' کا مقام دیا گیا۔ 1947ء میں ہندوستان آزاد ہوا تو راجدھانی دہلی کے ممتاز مقام (چاندنی چوک) پر ان کا بلند و بالا مجسمہ عین شاہراہ پر نصب کر دیا گیا وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے کسی عمل کو ناموس رسول کے نام پر بے فائدہ جان دے دینا تو کہہ سکتے ہیں مگر اس کو ناموس رسول کی حفاظت کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ قربانی نہیں بلکہ نادانی ہے، جس کا تعلق نہ عقل سے ہے اور نہ اسلام سے۔'' (شتم رسول کا مسئلہ از وحید الدین خاں ص 71-72)

جلد ہی غازی علم الدین کے مقدمے کا چالان مسٹر لوئیس ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ پیشی کے روز غازی علم دین کو ہتھکڑیاں پہنا کر ایک بنچ پر بٹھا دیا گیا۔ آپ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھے اور چہرے سے کسی قسم کی مایوسی یا اُداسی نہ ٹپکتی تھی۔ مسٹر لوئیس کو سب سے پہلے پولیس کے وکیل نے استغاثہ کی کہانی سنائی۔ بعد ازاں استغاثہ کے گواہان کدار ناتھ، بھگت رام، پرمانند نانک چند اور آتما رام پیش ہوئے۔ ان سب نے اپنے انہی بیانات کو دہرایا جو قبل ازیں پولیس کو دیئے تھے۔ پوسٹ مارٹم کرنے والا سرجن بھی پیش ہوا۔ اس نے بتایا کہ مقتول کی موت اس کے پیٹ میں چھرا گھونپنے سے ہوئی۔ نقشہ نویس نے بھی پیش ہو کر اپنی کارروائی بتائی۔ اس کے بعد مسٹر لوئیس نے غازی علم الدین پر فرد جرم عائد کرتے ہوئے اس کا بیان لیا اور بغیر صفائی لیے مقدمہ سیشن عدالت کے سپرد کر دیا۔

سیشن کورٹ میں ایسے مقدمات سننے کے لیے بمشکل ایک سال بعد باری آتی ہے

مگر ہندوؤں کے اثر ونفوذ کی وجہ سے یہ کیس صرف ایک ہفتے بعد ہی سنا جانے لگا۔ مسٹر ٹیپ سیشن جج تھے۔ ٹیپ نے رسمی کارروائی کرتے ہوئے گواہان استغاثہ کے بیانات لینے شروع کیے۔ غازی علم دین کی طرف سے مسٹر سلیم بار ایٹ لاء نے انتہائی مدلل دلائل دیے اور اپنی قانونی گفتگو اور بحث سے قریباً قریباً یہ ثابت کر دیا تھا کہ اصل ملزم غازی علم دین نہیں ہے کیونکہ اسے واردات کرتے ہوئے راجپال کے ملازمین نے نہیں روکا، پھر وہ فرار بھی نہیں ہوا بلکہ اس نے آسانی سے گرفتاری دے دی، حالانکہ وہ بھاگ کر قریب ہی انارکلی کے پرہجوم بازار میں لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو سکتا تھا۔ سلیم صاحب نے اور بھی بہت سارے دلائل دیئے اور جج صاحب سے درخواست کی کہ علم دین کسی غلط فہمی کی بنا پر مجرم بن گیا ہے اور چونکہ یہ اصل قاتل نہیں، اس لیے اسے بری کیا جائے۔ عین اسی لمحے غازی علم دین زور زور سے چلانے لگے کہ ''شاتم رسول کا قاتل میں ہوں۔ میں نے ہی اس نابکار راجپال کو جہنم رسید کیا ہے''..... غازی علم الدین کے اقبال جرم کے بعد عدالت میں درمیانی مدت کا وقفہ ہو گیا، پھر کچھ ہی دیر بعد عدالت نے غازی علم دین کو موت کی سزا کا حکم سنا دیا۔ پھر ضابطہ فوجداری کی دفعہ 374 کی رو سے اپنے فیصلے کے لیے یہ مسل ہائی کورٹ میں بھجوا دی گئی۔ فیصلے کے وقت عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور فیصلے کے بعد سب لوگوں کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے جبکہ تنہا علم دین ہی بہت مطمئن اور مسرور تھا۔

نوجوان عاشق رسول غازی علم الدین کا مقدمہ سب مسلمانوں کا مقدمہ بن گیا تھا۔ عدالت کی طرف سے غازی علم دین کی سزائے موت کا سن کر پورے ملک میں کہرام مچنا لازمی تھا۔ لاہور میں بہت سے احتجاجی جلسے منعقد ہوئے اور ہائی کورٹ میں مقدمہ لڑنے اور کسی قابل وکیل کی خدمات حاصل کرنے کے لیے چندہ مہم شروع کی گئی تو ایک خطیر رقم جمع ہو گئی۔ اس زمانے میں مسٹر تیج بہادر سپرو ایک شہرت یافتہ وکیل تھے، بعض حضرات نے ان کا نام تجویز کیا۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کا گھرانہ ان دنوں علمی و ادبی اور دینی و سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا، علامہ اقبال خود بھی غازی علم دین کے بڑے قدردان تھے، اس لیے انہیں بھی اس مقدمہ سے بہت گہرا لگاؤ تھا اور اکثر رات کو ان کے ہمعصر دوستوں کی مجالس میں غازی صاحب کے مقدمہ کا بھی ذکر ہوتا۔ علامہ اقبالؒ کی خدمت میں جب باقاعدہ یہ معاملہ پہنچا تو آپ نے فرمایا کہ بلاشبہ سر تیج بہادر سپرو ایک شہرہ آفاق وکیل ہیں اور عربی کے بہت بڑے سکالر بھی، مگر

میرے خیال میں اس کیس کے لیے محمد علی جناح بہتر وکیل ثابت ہوں گے۔ سیشن کورٹ کے فیصلے کی مصدقہ نقل حاصل کر کے نامور وکلا نے اس کے بغور مطالعے کے بعد ہائی کورٹ میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل دائر کر دی تھی۔ چنانچہ علامہ اقبال کے مشورے سے ''علم دین ڈیفنس کمیٹی'' کے معززین نے بمبئی میں قائداعظم محمد علی جناح سے رابطہ کیا اور پھر اس کیس کی پیروی کے لیے انہیں قائل کر کے لاہور لے آئے۔ لاہور کے معروف ماہر قانون مسٹر فرخ حسین بیرسٹر ایٹ لاء نے ان کی معاونت کی۔ مسٹر جے لال کپور مقتول راجپال کی جانب سے اور دیوان رام لال سرکار کی طرف سے پیش ہوئے جبکہ اس مقدمے کی سماعت مسٹر براڈوے اور مسٹر جان سٹون ہائی کورٹ پنجاب نے کی۔ اس موقع پر قائداعظم محمد علی جناح نے بڑی فاضلانہ اور مدلل بحث کرتے ہوئے عدالت کو مندرجہ ذیل نکات بتائے:

- اگر کدار ناتھ اور بھگت رام چشم دید گواہ ہیں تو ان دونوں نے مل کر مقتول کو بچانے اور قاتل کو پکڑنے کی کوشش کیوں نہ کی؟
- کدار ناتھ اور بھگت رام کی شہادت اس لیے بھی غیر مؤثر ہے کہ یہ دونوں مقتول کے ملازم ہیں۔
- تھانے کی FIR میں بھگت رام کی موجودگی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لیے یہ شہادت غیر مؤثر ہے۔
- مقتول نے تحریر کے ذریعے مسلمانوں کی عظیم ترین مقدس ہستی حضور نبی کریم ﷺ کی توہین کی جسے کوئی بھی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔ مقتول کا یہ فعل محض اشتعال انگیزی ہے۔ اس لیے ملزم کے خلاف دفعہ 302 قتل عمد کے بجائے زیر دفعہ 308 قتل بوجہ اشتعال کارروائی کی جانی چاہیے اور ملزم کو موت کے بجائے زیادہ سے زیادہ سات سال کی قید کا مستوجب سمجھنا چاہیے۔
- استغاثہ کی کہانی کے مطابق ملزم نے چھرا آتمارام دکاندار سے خریدا ہے۔ آتمارام مذکور بہت ہی بوڑھا ہے، اس کی نظر اتنی کمزور ہے کہ وہ ملزم کو بآسانی شناخت نہیں کر سکتا۔
- آتمارام گواہ کا بیان ہے کہ اس نے ایک نیا چھرا ملزم کے پاس بیچا تھا۔ مگر پولیس نے جو چھرا برآمد کر کے عدالت میں پیش کیا ہے، وہ پرانا ہے اور اس کی نوک شکستہ ہے، اس سے کسی انسان کا قتل ہونا مشکل ہے۔

- حضور نبی کریم ﷺ کی ذات پر رکیک حملے کرنا اور اس طرح مختلف مذاہب میں نفرت پھیلانا، زیر دفعہ 153۔ الف جرم ہے۔ متنازعہ کتاب انتہائی گستاخانہ اور دلآزار ہے۔ اسے پڑھ کر کوئی بھی مسلمان اپنے نبی ﷺ کی عزت و ناموس کا بدلہ لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اندریں حالات اس جرم کو قتل عمد زیر دفعہ 302 ہرگز شمار نہیں کرنا چاہیے بلکہ زیر دفعہ 308 کے تحت پھانسی کے بجائے زیادہ سے زیادہ سات سال قید کی سزا ملنی چاہیے۔
- ملزم تقریباً 20 سالہ نوجوان ہے، اس کے لیے موت کی سزا انتہائی سنگین ہے۔

قائداعظم محمد علی جناح کے مدلل اور ناقابل تردید حقائق بیان کرنے کے بعد مقتول کے وکیل مسٹر جے لال کپور نے دلائل دیئے جو غازی علم دین کی اپیل کے خلاف اور اس کی موت کی سزا بحال رکھنے کے حق میں تھے۔ چونکہ حکومت میں تمام لوگ ہندو یا سکھ تھے، اس لیے رحم کی اپیل کے خلاف انہی کا زور چل رہا تھا۔ چنانچہ فریقین کے دلائل سننے کے بعد حاضرین کو کمرہ عدالت سے باہر نکلوا دیا گیا۔ عدالت نے ایڈووکیٹ جنرل رام دیوان لال کے دلائل سنے بغیر غازی علم دین کی اپیل خارج کر دی اور ماتحت عدالت کا فیصلہ بحال رکھا۔ اس بار بھی جب جیل میں غازی علم دین کو ہائی کورٹ میں اپیل نامنظور ہونے کے بارے میں بتایا گیا تو وہ قطعاً ملول ہونے کے بجائے بہت فرحاں و شاداں دکھائی دیے اور ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

بال چراغ عشق دا میرا روشن کر دے سینہ
دل دے دیوے دی رشنائی جاوے وچ زمیناں

مسلمان اگرچہ سرکار انگلشیہ کے یکطرفہ اور معاندانہ رویے سے بہت غمگین تھے مگر پریوی کونسل (برطانوی بادشاہ کی خاص مجلس مشاورت، جس کا فیصلہ حتمی اور آخری ہوتا ہے) کے دروازے پر دستک دینے میں بھی ایک خاص مصلحت کارفرما تھی جبکہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ تو ابتدا ہی سے مقدمہ بازی کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ غازی علم دین اور عدالت کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ اس معاملہ میں اپیل گناہ ہے اور غازی علم دین کو ایسی حسین موت کی آغوش سے چھین لینا غازی علم دین کی ذات پر بڑا ظلم ہے مگر علامہ اقبال اور دیگر زعماء کی رائے تھی کہ اگر اپیل نہ کی گئی تو غیر مسلم اس کا یہ مطلب نکالیں گے کہ علم دین لاوارث ہے۔ چنانچہ حجت پوری کرنے کے لیے یہ قانونی کارروائی بھی ہونی چاہیے۔ پریوی

کونسل لندن میں اپیل کے لیے کافی اخراجات درکار تھے، جس کے لیے فوری طور پر چندہ جمع کیا گیا اور پھر اس اپیل کا مسودہ بھی قائداعظم محمد علی جناحؒ کی نگرانی میں تیار ہوا جس میں واقعات اور قانونی ضابطوں کی نشاندہی کرنے کے علاوہ اس امر پر زیادہ زور دیا گیا تھا کہ پریوی کونسل یہ امر تسلیم کرے کہ مسلمان اپنے آخری نبی الزمان ﷺ سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور آپ ﷺ کی حرمت پر کٹ مرنے کو تیار ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کی سزا موت ہونی چاہیے اور ایسے شاتم کو قتل کرنے والے کو غازی کا خطاب ملنا چاہیے۔ لیکن افسوس پریوی کونسل نے وہی کیا جس کی توقع تھی یعنی غازی علم دین کی اپیل نامنظور کر دی۔ اصل میں وہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو زیادہ خوش کرنا چاہتی تھی۔ غازی علم دین کو جونہی اس فیصلے کی اطلاع ملی تو وہ ''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگا کر خوشی سے اچھل پڑے اور کہا کہ ''کاتب تقدیر نے شہادت کا رتبہ پانا میری قسمت میں روزِ ازل ہی سے لکھ دیا تھا۔ ان شاء اللہ اب مجھے دربار رسالت ﷺ میں حاضری دینے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ یقیناً میری قربانی اللہ تعالیٰ نے قبول فرما لی ہے اور وہ دن دور نہیں، جب میری روح بہشت بریں میں آقائے نامدار ﷺ کی زیارت سے مستفید ہو رہی ہوگی.....'' اس کے بعد وہ انتہائی خوش وخرم رہنے لگے اور حقیقی منزل تک پہنچنے کے لیے بے قرار نظر آنے لگے۔

پریوی کونسل کے فیصلے سے مسلمان سخت غصے میں آ گئے کہ اتنی مہذب اور متمدن قوم کے ججوں کو جو خود بھی اہل کتاب ہیں، کیوں ایک پیغمبر کی حرمت کا احساس نہ ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں کے جوش واشتعال کو دیکھتے ہوئے کہ مبادا شہر میں کہیں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات نہ شروع ہو جائیں، حکومت نے مجاہد تحفظ ناموس رسالتؐ غازی علم دین کو لاہور سے بہت دور میانوالی جیل منتقل کر دیا۔

غازی علم الدین کی شہادت سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے غازی صاحب کے والد محترم میاں طالع مند کی میانوالی ریلوے اسٹیشن پر امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری سے ملاقات ہوئی۔ شاہ صاحب نے میاں طالع مند سے فرمایا۔ ''میاں صاحب! غازی صاحب کی شہادت کے روز نجانے کتنے غوث، قطب، ابدال اور شیوخ عظام تشریف لائیں گے، اس لیے ان کی موجودگی میں رونے پیٹنے سے گریز کرنا''۔

ذیل کا واقعہ قارئین کے لیے نہایت دلچسپی کا باعث ہوگا۔ مغربی پاکستان کے سابق

گورنر نواب آف کالا باغ ملک محمد امیر خاں مرحوم کے والد نواب عطا محمد، غازی علم الدین شہیدؒ سے بے حد عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ وہ میانوالی جیل میں غازی صاحب سے ملاقات کرنے کے لیے اکثر حاضر ہوا کرتے۔ ایک موقع پر انہوں نے میاں طالع مند سے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں علم الدین کو (غالباً معروف زمانہ محمد خاں ڈاکو کے ذریعے) جیل سے فرار کروا دیتا ہوں" جب یہ بات برادر غازی کے ذریعے حضرت علامہ اقبال تک پہنچی تو آپ نے فرمایا "ہم ایسا کبھی نہ کریں گے۔ اگر غازی علم الدین کو فرار کروایا گیا تو غیر مسلم ہمیں بزدلی کا طعنہ دیں گے، وہ سمجھیں گے کہ مسلمان ناموس رسالت ﷺ پر قربان ہو جانے کے بجائے اپنی زندگی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نکالا جائے کہ غازی علم الدین اپنے اس فعل پر پچھتانے لگا تھا، پھر یہ ایک ایسا داغ ہوگا جو کبھی دھل نہ سکے گا"۔

حسن اتفاق سے ان دنوں راجہ زماں مہدی خاں میانوالی کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ وہ اسلامی تعلیمات سے محبت رکھنے والے نیک دل انسان تھے۔ انہیں غازی علم دین کے واقعہ کا علم ہوا تو وہ جیل میں ایک زائر کی حیثیت سے آئے اور انہوں نے گستاخ رسول کو جہنم واصل کرنے پر غازی علم دین کو مبارک دی اور کہا کہ حضور نبی کریم ﷺ کے دربار میں حاضری کے موقع پر مجھ گنہگار کی مغفرت کے لیے بھی درخواست کرنا..... ڈپٹی صاحب کی غازی صاحب سے طویل گفتگو بھی ہوئی جس میں غازی صاحب نے کہا کہ عام طور پر قتل کے ملزم دو تین سال تک جیلوں میں پڑے رہتے ہیں، تب جا کر انہیں پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے مگر میرے معاملے میں یہ معجزہ ہے کہ صرف سوا چھ ماہ ہی میں مقدمے کے تمام مراحل طے ہو گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب مجھے زیادہ دن اس دار فانی میں نہ رکھا جائے اور جتنی جلد ممکن ہو، میری روح جسم کی قید سے آزاد کر دی جائے تا کہ میں بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضری دے سکوں .....

راجہ زماں مہدی کو یہ خیال آ رہا تھا کہ وہ پھانسی پانے والے بے شمار قیدیوں کو دیکھ چکے ہیں جو عام طور پر موت کی سزا سن کر حواس باختہ اور غم و فکر سے سوکھ کر کانٹا ہو جاتے ہیں مگر غازی علم دین کی کیفیت ہی کچھ اور ہے، کمال صبر و استقلال، چہرے پر نور، لبوں پر مسکراہٹ اور جسم کے وزن میں مسلسل اضافہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں حرمت رسول ﷺ پر قربان ہونے میں تائید ایزدی حاصل ہے۔

غازی علم الدین شہیدؒ کی عظمت پر مبنی ایک ایمان افروز واقعہ ملاحظہ کیجیے:

❑ ''1953ء کی تحریک ختم نبوت میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے امیر قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ گرفتار ہو کر میانوالی جیل میں قید ہوئے۔ دورانِ قید میں ان کی ملاقات عبداللہ نامی ایک ایسے خوش نصیب قیدی وارڈن سے ہوئی جو جیل میں غازی علم الدین شہید کی نگرانی پر مامور تھا۔ عبداللہ نے قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو کئی مواقع پر غازی علم الدین شہیدؒ کے حالات و واقعات سنائے۔ ایک دن عبداللہ وارڈن نے قاضی صاحب کو بتایا کہ آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ غازی علم الدین شہیدؒ والی کوٹھری میں قید ہیں۔ قاضی صاحب نے عبداللہ سے درخواست کی کہ وہ غازی علم الدین شہیدؒ کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ سنائے۔ عبداللہ وارڈن کے چہرے پر مزید نورانیت اور بشاشت اتر آئی۔ پھر اس نے بتایا کہ 31 اکتوبر 1929ء کو جب غازی علم الدین شہید کو پھانسی ہونا تھی، اس سے ایک روز پہلے میں حسب معمول غازیؒ کی کوٹھڑی کا پہرہ دے رہا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے میں کوٹھری سے ذرا فاصلے پر عام قیدیوں کی بیرک کی طرف آ گیا۔ مڑ کر کیا دیکھتا ہوں کہ غازی کا کمرہ خوبصورت اور دلکش روشنیوں سے بھر گیا ہے۔ میں یہ سمجھا کہ شاید غازی علم الدین شہیدؒ نے اپنے کمرے کو آگ لگا لی ہے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ نور کا ایک بادل ہے جو تیزی سے آسمانوں کی طرف چلا گیا۔ چنانچہ میں بھاگم بھاگ غازیؒ کی کوٹھری کی طرف بھاگا۔ اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پورا کمرہ بہترین اور مسحور کن خوشبوؤں سے معطر اور منور تھا۔ غازیؒ حالت سجدہ میں زار و قطار رو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اٹھے تو میں نے ان کی قدم بوسی کی اور خود بھی بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ پھر میں نے عرض کی، غازی صاحب یہ کیا ماجرا تھا؟ غازی صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر عرض کی کہ حضرت! آپ یہ اہم راز اپنے سینے میں لے کر نہ جائیں اور اس واقعہ کی تفصیلات ضرور بتائیں، بہرحال غازی صاحب نے میرے بے حد اصرار پر فرمایا، عبداللہ! تمھیں معلوم ہے کہ مجھے کل پھانسی ہو رہی ہے۔ میری دلجوئی اور حوصلہ افزائی کے لیے شافع محشر، حضور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اپنے خاص صحابۂ کرامؓ کے ساتھ یہاں خود تشریف لائے اور بڑی محبت اور شفقت فرمائی۔ اس موقع پر حضرت علیؓ نے مجھ سے پوچھا کہ غازی بیٹا! تمھیں پھانسی کا خوف تو نہیں ہے؟ میں نے عرض کیا۔ حضور! بالکل نہیں۔ فرمایا: بیٹا اگر کوئی خوف ہے تو آؤ ہمارے ساتھ چلو۔ میں نے پھر عرض کیا۔ حضور! نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ پھر پیارے آقا و مولا حضور نبی کریم ﷺ

نے میرے سر پر اپنا دست مبارک رکھ کر فرمایا: غازی بیٹا! پھانسی کے وقت جیل حکام تم سے تمہاری آخری خواہش پوچھیں گے، تم کہنا کہ میرے ہاتھ کھول دیں۔ میں پھانسی کا پھندا چوم کر خود اپنے گلے میں ڈالنا چاہتا ہوں تا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ مسلمان اپنے پیارے نبی ﷺ کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا سب سے بڑی سعادت سمجھتا ہے۔ دوسرا یہ کہ تم روزہ رکھ کر آنا، میں تمام صحابۂ کرامؓ اور فرشتوں کے ہمراہ حوض کوثر پر تیرا استقبال کروں گا اور ہم سب روزہ اکٹھے افطار کریں گے"۔ یہ ہے تحفظ ناموس رسالت ﷺ کا صلہ!

نامور دانشور جناب صاحبزادہ خورشید گیلانی اپنے مضمون "شہید محبت" میں لکھتے ہیں:

"علامہ اقبالؒ کا ایک مصرع ہے:

طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

یعنی بعض اوقات ایک آہ کے فاصلے پر منزل ہوتی ہے یا لمحے بھر میں سو سال کا سفر طے ہو جاتا ہے، یہ مصرع زبان پر آتے ہی ذہن بے اختیار شہید ناموسِ نبی ﷺ غازی علم الدین کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اس نے صدیوں کا سفر اس تیزی اور کامیابی سے طے کیا کہ اربابِ زہد و تقویٰ اور اصحابِ منبر و محراب بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس نے ایک قدم انارکلی ہسپتال روڈ پر اٹھایا اور دوسرے قدم پر جنت الفردوس میں پہنچ گیا۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

اسی جنت کی تلاش میں زاہدوں اور عابدوں کے نجانے کتنے قافلے سرگرداں رہے، کیسے کیسے لوگ غاروں کے ہو کر رہ گئے، کئی پیشانیاں رگڑتے اور سر پٹختے رہے، ہزاروں سربگریباں، چلہ کش اسی آرزو میں دنیا سے اٹھ گئے، لاکھوں طواف و سجود میں غرق رہے، بے شمار صوفی و ملا وقف دعا رہے، اَن گنت پرہیزگار خیالِ جنت میں سرشار رہے، خدا ان سب کی محنت ضرور قبول کرے گا، لیکن غازی علم الدین کا مقسوم دیکھیے! نہ چلہ کیا نہ مجاہدہ، نہ حج کیا، نہ عمرہ کیا، نہ حرم کا مجاور بنا، نہ مکتب میں داخلہ لیا، نہ خانقاہ کا راستہ دیکھا، نہ کنز قدوری کھول کر دیکھی، نہ رازی و کشاف کا مطالعہ کیا، نہ حزب البحر کا ورد کیا، نہ اسم اعظم کا وظیفہ پڑھا، نہ علم و حکمت کے خم و پیچ میں الجھا، نہ کسی حلقۂ تربیت میں بیٹھا، نہ کلام و معانی سے واسطہ رہا نہ فلسفہ و منطق سے آشنا ہوا، نہ مسجد کے لوٹے بھرے، نہ تبلیغی گشت کیا، نہ کبھی شیخی بگھاری نہ کبھی شوخی دکھائی، اسے پاکبازی کا

خبط نہیں، محبوبِ حجازی ﷺ سے ربط تھا۔ وہ تسبیح بدست نہیں، مست مئے الست تھا، وہ فقیہ مسند آرا نہیں، فقیر سرِ راہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مصلحت کیشی سے نہیں، جذبۂ درویشی سے کام لیا، چنین و چناں کے دائروں سے نکل کر کون و مکاں کی وسعتوں میں جا پہنچا، وہم و گمان کی خاک جھاڑ کر ایمان و عشق کے نور میں ڈھل گیا، نجانے ہاتفِ غیب نے چپکے سے اس کے کان میں کیا بات کہی کہ پل بھر میں دل کی کائنات بدل گئی ۔

پروانے کا حال اس محفل میں، ہے قابل رشک اے اہل نظر
اک شب میں ہی یہ پیدا بھی ہوا، عاشق بھی ہوا اور مر بھی گیا

خدا معلوم کتنی ریاضت سے آغوشِ بسطام نے بایزیدؒ کی پرورش کی، خاکِ بغداد نے جنیدؒ کو جنم دیا، شہر قونیہ نے مولانا رومؒ کو بنایا، دہلی نے شاہ ولی اللہؒ کو پیدا کیا اور ادھر علم الدینؒ، بڑھئی کی دکان سے اٹھا اور ایک ہی جست میں زمان و مکان طے کر ڈالے"۔

سیال شریف کے سجادہ نشین حضرت خواجہ پیر حافظ محمد ضیاالدین سیالویؒ نے جیل میں غازی علم الدین ملاقات کی۔ پیر صاحب آپ کے جمال و جلال سے اتنے مرعوب ہوئے کہ آپ اُن سے کوئی خاص بات تو نہ کر سکے، البتہ سورۃ یوسف پڑھنے لگ گئے۔ آپ ایک پختہ قاری اور حافظ قرآن تھے مگر سورۃ یوسف کے پڑھنے کے لیے یارا نہ پا سکے اور وفورِ جذبات کی وجہ سے بار بار رُکنے لگے۔ اس پر غازی علم الدین نے ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ آپ بسم اللہ پڑھ کر ایک دفعہ پھر سے شروع کریں۔ چنانچہ آپ نے دوبارہ تلاوت شروع کی مگر روانی اب کے بھی نہیں تھی۔ عالم وجد میں گلوگیر ہو کر رُک جاتے اور کسی اور عالم میں پہنچ جاتے۔ غازی علم الدین جو قرآن شریف نہیں پڑھے ہوئے تھے اور جنہیں سورۃ یوسف پہلے ہرگز نہیں آتی تھی، پیر صاحب کو صحیح لقمے دیتے رہے اور اس طرح سورۃ یوسف مکمل کرنے میں پوری پوری مدد دی۔ پیر صاحب جب ملاقات کر کے باہر آئے تو فرط حیرت و استعجاب کی وجہ سے بول نہیں سکتے تھے۔ صرف اتنا ہی فرمایا کہ میں علم الدین کے لبادے میں کوئی اور ہستی پاتا ہوں۔ کون کہتا ہے کہ غازی علم الدین اَن پڑھ ہے، اُسے تو علم لدنی حاصل ہے اور وہ کائنات کے تمام اسرار و رموز سے واقف ہے۔

عین اسی وقت دوسری جانب ایک عجیب ہلچل مچی ہوئی تھی۔ غازی علم دین کے ورثا کی یہ درخواست مسترد ہو گئی تھی کہ علم دین کو پھانسی میانوالی کے بجائے لاہور میں دی جائے۔

انہیں اپنے اس مطالبہ کا واضح جواب ملنے کے بجائے کسی اور ذریعہ سے اس خبر کی بھنک لگ گئی کہ علم دین کو کل صبح پھانسی دی جائے گی اور یہ کہ میت کو بھی لاہور لانے کی اجازت نہیں..... یہ خبر پورے لاہور میں تیزی سے پھیل گئی۔ بڑی تعداد میں لوگ شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں گشت کرنے لگے۔ مسلمانوں کی کثیر تعداد اخبارات کے دفاتر کا رُخ کر کے تازہ ترین صورت حال جاننے کی کوشش کرتی۔ چاروں جانب ''اللہ اکبر'' کے نعرے گونجنے لگے۔ علم دین زندہ باد کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ مسلمانوں کو اس بات پر بہت اشتعال تھا کہ میت کو لاہور لانے سے روکنے کے بہانے کیوں تراشے جا رہے ہیں جبکہ غازی علم دین کی واضح وصیت ہے کہ انہیں لاہور میں دفن کیا جائے۔ مگر وقت کے حاکموں نے کسی کی ایک نہ سنی۔

30 اکتوبر 1931ء کو جب غازی علم الدین سے ان کے اہل خانہ اور دیگر عزیز و اقارب جیل میں انہیں ملنے گئے تو انہیں معلوم ہوا کہ آج غازی علم الدین صاحب بہت ہی خوش ہیں۔ اہل خانہ نے غازی صاحب سے اس بے پناہ خوشی کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''آج مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دیدار نصیب ہوا ہے جو مجھے خواب میں ملے اور خوشخبری سنائی۔ ''اے علم الدین! تجھے مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے تیری قربانی قبول فرمالی ہے اور حضور خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کے دربار عالیہ میں تیرا تذکرہ کثرت سے ہوتا ہے۔ میں اس پر خوش ہوں کہ عنقریب دربار رسالت مآب ﷺ میں پہنچ جاؤں گا''۔

31 اکتوبر 1929ء بروز جمعرات پروانہ شمع رسالت غازی علم دین نے حسب معمول تہجد کی نماز پڑھی اور درود و وظائف میں مصروف تھے کہ انھیں کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر کمرے کے بند دروازے کے سامنے ہی کسی کے رکنے کی آواز کے کھٹکے پر غازی صاحب نے جو ادھر دیکھا تو پھانسی دینے والے عملہ کو اپنا منتظر پایا۔ اس موقع پر داروغہ جیل کی آنکھوں سے شدت جذبات سے آنسو بہہ نکلے..... آپ نے اس کی طرف دیکھا اور کہا تم گواہ رہنا کہ میری آخری آرزو کیا تھی۔ آپؒ نے معمول سے بھی کم وقت میں نماز ادا کی..... اتنی جلدی آخر کس لیے تھی۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ بات ہو کہ کہیں مجسٹریٹ یہ تصور نہ کرے کہ محض زندگی کی آخری گھڑیوں کو طول دینے کے لیے دیر کر رہا ہوں۔ داروغہ جیل نے بند دروازہ کھولا..... آپ اٹھے اور مسکراتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ دایاں پاؤں کمرے سے باہر رکھتے ہوئے انھوں نے مجسٹریٹ سے کہا۔ چلیے! دیر نہ کریں۔ اس کے

ساتھ ہی آپ تیز تیز قدم اٹھاتے تختۂ دار کی جانب چل پڑے۔ ایک کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے آپ نے ہاتھ اٹھا کر ایک قیدی کو خدا حافظ کہا..... جواباً اس نے نعرۂ رسالت ﷺ بلند کیا۔ تب جیل حکام اور مجسٹریٹ کو معلوم ہوا کہ جیل میں سبھی قیدی علم الدین کو مبارک باد دینے کے لیے ساری رات سے جاگ رہے ہیں۔ کلمہ شہادت کے ورد سے فضا گونج رہی تھی۔ علم الدین لحہ بھر کے لیے رکے..... مجسٹریٹ اور پولیس کے دستے کی طرف دیکھا، ان کے لب ہلے اور پھر چل دیے۔ تختۂ دار کے قریب متعلقہ حکام کے علاوہ مسلح پولیس کے جوان بھی کھڑے تھے۔ سب کی نظریں آپ پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کی نظروں نے اس سے پہلے بھی کئی لوگوں کو تختۂ دار تک پہنچتے دیکھا تھا لیکن جس شان اور قوتِ ارادی سے انھوں نے علم الدین کو تختۂ دار کی جانب بڑھتے دیکھا، وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ جو ''حیات'' علم الدین کو نصیب ہونے والی تھی، اس کا تو ہر مسلمان آرزومند رہتا ہے۔ اس وقت آپ کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی ہوئی تھی اور آپ کو مخصوص لباس پہنا دیا گیا۔ جب مجسٹریٹ نے آپ سے آپؒ کی آخری خواہش پوچھی تو آپ نے فرمایا: ''میں پھانسی کا پھندا چوم کر خود اپنے گلے میں ڈالنا چاہتا ہوں تا کہ دنیا کو معلوم ہو کہ حضور نبی کریم ﷺ کی عزت و ناموس کا دفاع کرنے والے موت سے نہیں ڈرتے اور بصد فخر و انبساط اس کا انتظار اور استقبال کرتے ہیں''۔ مجسٹریٹ نے آپ کی یہ آخری خواہش مسترد کر دی۔ بعدازاں علم الدین کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔ اس دوران میں آپ نے اردگرد کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''تم گواہ رہو کہ میں نے حرمت رسول ﷺ کے لیے راجپال کو قتل کیا ہے۔ اور گواہ رہنا کہ میں عشق رسول ﷺ میں کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے جان دے رہا ہوں۔ آپ نے کلمہ شہادت با آوازِ بلند پڑھا اور پھر رسنِ دار کو بوسہ دیا۔ علم الدین حقیقت میں ہر اس شے کو مبارک سمجھتے تھے جو ان کو بارگاہِ حبیب میں پہنچانے کا ذریعہ بن رہی تھی۔ آپ کے گلے میں رسہ ڈال دیا گیا۔ مجسٹریٹ کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور ایک خفیف اشارے کے ساتھ ہی آپ کے پاؤں کے نیچے سے تختہ کھینچ لیا گیا..... چند لمحوں میں ہی آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی..... اس نے جسم کو تڑپنے پھڑکنے کی بھی زحمت نہ ہونے دی۔ گویا حضرت عزرائیل علیہ السلام نے عاشق رسول ﷺ کی جان ان کے جسم سے رسہ لٹکنے سے پہلے ہی قبض کر لی ہو اور پھانسی کی زحمت سے بچا لیا ہو۔ ڈاکٹر نے موت کی تصدیق کی اور آپ کے لاشہ کو

پھانسی کے تختہ سے اتارا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

فرنگی حکومت نے غازی علم دین شہیدؒ کو موت کی سزا دے کر ہندو اکثریت کو تو خوش کر لیا تھا مگر اس سے بھی اہم مسئلہ غازی موصوف کے کفن دفن کا تھا۔ انگریز کا خیال تھا کہ اگر غازی علم دین کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے میت کو لاہور بھیجا گیا تو یقیناً ہندو مسلم فسادات شروع ہو جائیں گے جن پر قابو پانا مشکل ہوگا۔ غازی علم الدین شہیدؒ کی شہادت پر میانوالی میں فرنگی حکومت کے خلاف زبردست احتجاجی جلوس نکلے، ہڑتالیں ہوئیں، شہیدؒ کا سوگ منایا گیا، غم و غصہ کا اظہار ہوا۔ حکومت وقت نے میانوالی کے کئی افراد کو گرفتار کیا، ان پر مقدمہ چلایا جس میں ان کو چھ چھ ماہ قید اور جرمانے کی سزا دی گئی۔ غازی علم الدین شہیدؒ کی شہادت کے بعد ناعاقبت اندیش گورنر کی ہدایت کے مطابق جنازہ کے بعد غازی شہیدؒ کو بے یار و مددگار ایک مردہ اور بے بس قوم کا فرد سمجھ کر اس کی پاک میت کو میانوالی میں قیدیوں کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔ یہ خبریں جب لاہور اور ملک کے دوسرے حصوں میں پہنچیں تو پوری مسلمان قوم گھروں سے باہر آ گئی اور انہوں نے غازی موصوف کی میت لینے کے لیے اپنے مطالبے میں انتہائی شدت پیدا کی۔ لاہور کی تمام شاہراہوں بلکہ گلی کوچوں کے در و دیوار پر بھی جلی حروف میں لکھا پڑھا جا رہا تھا: ''غازی علم دین کی میت ملت اسلامیہ کے حوالے کرو۔'' کچھ مسلمان تو جوش ایمانی میں معہ بوریا بستر میانوالی پہنچ گئے کہ چاہے کتنی ہی مصیبت کیوں نہ اٹھانی پڑے، جب تک رسالت مآب ﷺ کے فدائی کی میت نہیں ملے گی، ہم واپس نہ آئیں گے۔ چنانچہ اسی روز (31 اکتوبر 1929ء) کی رات بعد نماز عشاء باغ بیرون موچی دروازہ میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں یہ قرارداد پاس ہوئی:

- ''مسلمانانِ لاہور کا یہ جلسہ حکومت سے درخواست کرتا ہے کہ وہ غازی علم دین شہید کی میت مسلمانوں کے حوالے کر دے تاکہ وہ شہید کی وصیت کے مطابق اسے لاہور میں دفن کر سکیں''۔

چنانچہ اب جلسے جلوسوں کا سلسلہ چل نکلا۔ 5 نومبر کو ایک بہت زبردست جلوس امیر بخش پہلوان کی قیادت میں نکلا جس میں کالجز کے طلبا اور رضا کاروں نے اپنے اپنے بستر کاندھوں پر اٹھا رکھے تھے۔ جلوس جب بھاٹی دروازہ پہنچا تو جلسہ شروع ہو گیا۔ مولانا ظفر علی خاں حکومت پر زبردست نکتہ چینی کر رہے تھے۔ غلام مصطفیٰ حیرت کے بھائی الطاف حسین نے کہا:

''اگر خواتین کا کوئی دستہ سول نافرمانی کے لیے تیار ہو تو میری والدہ سب سے پہلے اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار ہے''۔اب احتجاج میں شدت آتی گئی۔ ہر مسلمان شہید کی لاش مسلمانوں کے حوالے کرنے کے مطالبہ پر کمر بستہ تھا۔اس واقعہ سے پورے پنجاب بلکہ برصغیر میں غم و غصے کی فضا چھا گئی۔ اس جلسے کے اختتام پر مسلمان معززین کا ایک وفد ساڑھے چار بجے گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر پنجاب سر جیفری ڈی مونٹ مورنسی سے ملا۔ اس وفد میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ، سر میاں محمد شفیعؒ، چوہدری دین محمد، سید مراتب علی شاہ اور میاں عبدالعزیز بیرسٹر وغیرہ شامل تھے۔اس کے علاوہ ایک اور وفد 6 نومبر کو اڑھائی بجے کے قریب دوبارہ گورنر پنجاب سے ملا۔ اس روز مذکورہ ارکان کے علاوہ مولانا ظفر علی خان، سر فضل حسین، خلیفہ شجاع الدین، میاں امیر الدین، مولوی غلام محی الدین قصوری اور مولانا سید حبیب شاہ وغیرہ سرفہرست تھے۔سی آئی ڈی اور دیگر مخصوص ذرائع سے مسلم اور ہندوؤں کے جذبات کا گورنر کو بخوبی علم تھا۔گورنر نے سب سے پہلا سوال یہ کیا کہ اگر میت کے لاہور آنے پر فساد ہو گیا تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ اس پر علامہ اقبالؒ جھٹ بول اُٹھے: ''یور ایکسیلنسی! اگر ایسی بات ہو گئی تو میری گردن اُڑا دینا'' اس کے بعد آپ کے چہرے سے جلال برسنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد آپ کی آنکھیں پرنم ہو گئیں اور فرمایا: ''ہم عاشق رسول ﷺ کی محبت میں اپنے مطالبے سے کسی صورت دست بردار نہیں ہو سکتے۔'' حاضرین کے جوش کی یہ کیفیت دیکھ کر گورنر نے کہا۔''اچھا، آپ کو میت تو مل جائے گی مگر شرائط یہ ہیں کہ (1) جنازہ شہر کے اندر سے نہ گزرے۔ (2) مسلمان اپنے جذبات قابو میں رکھیں اور اشتعال انگیز نعرے نہ لگائیں۔ (3) قیام امن و امان کے لیے اخبارات میں ہیجان انگیز اداریے اور اشتعال والی خبروں کی اشاعت بند کر دیں اور (4) مسلمان احتجاجی جلوس اور جلسے منعقد کرنا بند کر دیں۔

باہمی رضامندی سے یہ فیصلہ مشتہر کیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کا ایک وفد سید مراتب علی شاہ گیلانی اور مرزا مہدی حسن مجسٹریٹ کی قیادت میں 13 نومبر 1931ء کو میانوالی پہنچا۔ راجہ مہدی زمان خان ڈپٹی کمشنر نے فرائض میزبانی ادا کیے۔ دوسرے دن علی الصبح شہید کی میت کو بصد احترام ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لایا گیا۔ وہاں اسے سید مراتب علی شاہ کے بنوائے ہوئے ایک مضبوط تابوت میں بند کیا گیا۔ اس تابوت کے اندر جست لگا ہوا تھا اور جست پر روئی کی دبیز تہہ تھی۔ سر کی طرف نرم و ملائم تکیے رکھے تھے۔ وفد اور میانوالی کے موجود الوقت لوگوں کا بیان ہے کہ دو ہفتے گزر جانے کے باوجود میت ایسی تھی کہ جیسے ابھی انہیں شہید کیا گیا!

ہوحتیٰ کہ چہرے پر جلال و جمال کا حسین امتزاج تھا اور ہونٹوں پر گلاب ایسی مسکراہٹ تھی۔ قبر کی مٹی سے جنت کی خوشبو آ رہی تھی۔ میت کو گیلانی صاحب نے تابوت میں خود اپنے ہاتھوں سے رکھا اور ایک گاڑی میں اسے میانوالی ریلوے اسٹیشن لے آئے جہاں ایک سپیشل ٹرین غازی علم دین کی میت لاہور پہنچانے کے لیے منتظر کھڑی تھی۔ یہ تاریخی گاڑی شام ساڑھے چار بجے میانوالی سے روانہ ہوئی اور 14 نومبر کو 5 بج کر 35 منٹ پر لاہور کینٹ کے سٹیشن سے ذرا دور نہر کے پل کے قریب کھڑی کر لی گئی۔ یہاں سے سنٹرل جیل قریب تھی۔ جیل کی دو گاڑیاں شہید اور اس کے محافظوں کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ محکمہ ریلوے نے میت محکمہ جیل کے حوالے کی اور محکمہ جیل نے وہ تابوت جس میں حرمت رسول ﷺ کا فدائی استراحت فرما رہا تھا، مسلم لیگ کے دو نمائندوں یعنی ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ اور سر محمد شفیع کے حوالے کر کے رسید لے لی۔ میانوالی سے لاہور تک کا سفر بہت ہی آرام اور شان و شوکت سے طے ہوا۔ ہر جگہ عوام صرف گاڑی کی زیارت کرنے کے لیے دور دور سے آئے تھے۔ جہاں جہاں گاڑی رُکی، مسلمانوں نے شہید پر اپنی عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کیے اور پرجوش نعرے لگائے۔

غازی علم دین شہید کی میت کا استقبال کرنے اور ان کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے لاہور کے علاوہ برصغیر کے دور دراز شہروں سے مسلمانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر تھا۔ شہید کا یہ جنازہ تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے جس میں مسلمانوں کے قریباً تمام مسالک کے بڑے چھوٹے تمام افراد موجود تھے۔ ہر طرف نعرہ تکبیر، کلمہ شہادت اور درود شریف کی روح پرور گونج سنائی دے رہی تھی۔ سرکاری حفاظتی انتظامات بہت وسیع تھے مگر مسلمانوں کو انگریز سے الجھنے یا ہندو سے انتقام لینے کی ہرگز فکر نہ تھی بلکہ وہ تو حرمت رسول ﷺ کے محافظ کی زیارت اور ان کا جنازہ پڑھنے سے غرض رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بڑا جنازہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا ہوا ہے۔ ایک ہی روز میں ان کا جنازہ چھ مرتبہ پڑھا گیا اور ہر دفعہ کم و بیش 50 ہزار لوگوں نے شرکت کی اور غائبانہ نماز جنازہ کا کوئی شمار ہی نہیں۔ 24 روز تک متواتر پڑھا جاتا رہا۔ پھر مولانا جلال الدین رومیؒ کا دوسرا بڑا جنازہ تھا اور صبح سے شام تک آپ کا جنازہ پڑھا گیا۔ تیسرا بڑا جنازہ غازی علم دین شہید کا تھا۔ جس میں ایک اندازے کے مطابق چھ لاکھ سے زائد انسان شامل ہوئے اور بقول روزنامہ ''انقلاب'' آپ کے جنازہ کا جلوس 5½ میل لمبا تھا۔

شہید کی میت کے لیے چارپائی ڈاکٹر محمد دین تاثیر مرحوم، سابق پرنسپل اسلامیہ

کالج، لاہور نے ازراہ عقیدت پیش کی تھی اور تابوت سرکاری طور پر نیشنل کالج آف آرٹس میں تیار ہوا۔ چارپائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس بندھے ہوئے تھے۔ چارپائی پر پھولوں کا بستر تھا اور اس بستر پر ایک چوبی تابوت تھا جو ہر قسم کی خوشبویات سے معطر تھا۔ اس تابوت میں مسلمانوں کے محبوب ہیرو کا جسد مبارک تھا۔ اس زمانے میں پرانی انارکلی اور چوبرجی کے درمیان کھیت تھے اور اس خیال سے کہ زائرین پانی کی قلت محسوس نہ کریں، کسانوں نے رہٹ چلا رکھے تھے۔ شہر بھر کے ماشکی جگہ جگہ مشکیں بھرے پھر رہے تھے اور کارپوریشن کی پانی کی گاڑیاں اِدھر اُدھر گشت کر رہی تھیں۔ فرطِ عقیدت سے معمور برقع پوش خواتین بھی اپنے پیارے نبی کریم ﷺ کی حرمت پر نثار ہونے والے سرفروش کا آخری سفر دیکھنے کے لیے کثیر تعداد میں میدان میں ایک کونے میں زیارت سے مستفیض ہونے کے لیے موجود تھیں۔

جلوس کے راستے میں جگہ جگہ میت پر پھولوں کی بارش کی گئی۔ شہید کے عقیدت مند ٹوکریوں، جھولیوں اور ٹوپیوں میں تروتازہ پھول بھر بھر کر لا رہے تھے۔ بعض لوگ گلاب، چنبیلی، موتیا اور رابیل کے عطر اور عرق کی بوتلیں انڈیل رہے تھے۔ کلمہ شہادت کا ورد بلند ہوتا جا رہا تھا۔ اخبارات ضمیمے شائع کر کے تازہ ترین حالات بتا رہے تھے۔ اکثر اخبارات کے حاشیے سیاہ تھے مگر اخبار ''سیاست'' کا سرورق شہید کے خون کی طرح سرخ تھا۔ اسی اخبار کے مالک سید حبیب ایک جید عالم اور مقبول مسلم راہنما تھے۔ آپ کے آنے پر علامہ اقبال نے پوچھا کہ شہید کی نماز جنازہ پڑھانے کا شرف کسے ہونا چاہیے؟ حبیب صاحب نے کہا کہ یہ شہید کے والد کا حق ہے جسے وہ نوازیں۔ طالع مند پاس ہی کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ حق مجھے ہے تو میں اسے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کو تفویض کرتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے سید حبیب کے مشورے سے سن رسیدہ اور عالم بے بدل مولانا سید دیدار علی شاہ انوری کا نام تجویز کیا مگر وہ رش کی وجہ سے بروقت تشریف نہ لا سکے تھے۔ چنانچہ پہلی دفعہ نمازِ جنازہ مولانا محمد شمس الدین خطیب مسجد وزیر خان نے پڑھائی اور دوسری دفعہ نمازِ جنازہ سید دیدار علی شاہ نے پڑھائی۔

نماز جنازہ کے اختتام پر میت کا جلوس پھر میانی کی طرف روانہ ہوا۔ جنازے کے جلوس نے چوبرجی سے میانی صاحب تک کا نصف میل کا فاصلہ ایک گھنٹہ میں طے کیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے قبر اپنی نگرانی میں بنوائی تھی۔ یہ بہاولپور روڈ اور عیدگاہ کے شمال میں ایک پختہ سڑک کے کنارے واقع ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے لحد میں اتر کر اس کی جسامت کا جائزہ لیا

اور کہا ''کاش! یہ مقام مجھے حاصل ہوتا''۔ مولانا محمد دیدار علی شاہ انوری اور علامہ اقبال نے میت کو اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا۔ لوگوں نے فرط جذبات سے لحد کے اندر اتنے پھول پھینکے کہ میت ان سے چھپ گئی۔ کچی اینٹوں سے تعویذ کو بند کیا گیا۔ کلمہ شہادت اور درود شریف کی گونج میں قبر پر مٹی ڈال دی گئی۔

شہید ناموس رسالت غازی علم الدین شہیدؒ کے جنازہ پر امیر ملت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ علی پوریؒ نے اپنی روحانی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

❑ ''دولت کا لالچ کیا ہے، نہ میرے دل میں کبھی حکومت کی خواہش پیدا ہوئی، نہ میں کسی دنیاوی حاکم سے آج تک کبھی مرعوب ہوا، حمد و نعت کی وارفتگی میں میری تار نفس بجتی رہتی ہے۔ میں نے کسی کے آگے بڑھ جانے کے متعلق بھی نہیں سوچا، حسد کی آگ سے خداوند قدوس نے مجھے ہمیشہ بچائے رکھا مگر غازی علم الدین شہیدؒ کا حال دیکھ کر میرے دل میں اس آرزو نے ضرور انگڑائی لی، کاش! یہ خوش قسمت موت مجھے نصیب ہوتی! میں نے بیت الحرام میں نمازیں ادا کیں، مسجد نبوی ﷺ میں سجدہ ریزیوں کا لطف بھی اٹھایا، مگر جو کیفیت غازی علم الدین شہیدؒ کے جنازے میں شامل ہو کر حاصل ہوئی، وہ مجھے کسی اور جگہ نہ ملی۔ کیا عجب ہے کہ خود سرکارِ دو عالم ﷺ اپنے غلام کے جنازے میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہوں اور میری اس کیفیت سرشاری کا سبب بھی یہی ہو''۔

غازی علم الدین شہیدؒ کے جنازہ کے موقع پر علامہ اقبالؒ نے نہایت حسرت بھرے جذبات میں فرمایا:

❑ ''اسیں تے گلاں ای کردے رہے تے ترکھان دا منڈا بازی لے گیا''۔ (یعنی ہم باتیں ہی بناتے رہے اور بڑھئی کا لڑکا ہم سب سے بازی لے گیا)

مولانا ظفر علی خاں نے غازی علم الدین شہیدؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

❑ ''شہید علم الدین کے خون کی حدت سے غیرت و حمیت کے وہ چراغ روشن ہوئے ہیں، جنھیں مخالف ہوا کے تند و تیز جھونکے بھی بجھا نہیں سکتے، آپؒ کی شہادت سے قوم کو ایک نئی زندگی ملی ہے، وہ زندگی جسے اب موت بھی نہیں مار سکتی''۔

ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم راہنما رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ نے آپ کی شہادت پر زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

❑ آپ نے ایک حسین موت کو گلے لگا کر قوم کی عزت رکھ لی ہے۔ آپ کے جذبہ سرفروشی سے ہماری رجعت قہقہری کی سیاہیاں دھل گئی ہیں۔ اس لیے آج ہر ایک غیرت مند مسلمان کے آئینہ دل میں شہید علم الدین کی تصویر دکھائی دیتی ہے"۔

امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے غازی صاحب کی شہادت پر کیا خوب فرمایا:

❑ "غازی علم الدین شہید کی فضیلت قید حروف میں اسیر نہیں ہو سکتی۔ میں نے ہر موضوع پر خطابت کے جوہر لٹائے ہیں مگر ان کے حال مطابق کچھ کہنے سے عاجز ہوں۔ میں تو سن فکر و عقل دوڑانے کے بجائے اس آیت کی تلاوت کیا کرتا ہوں۔ **ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللّٰہ اموات ؕ بل احیآء ولکن لاتشعرون (البقرہ:154)**

برصغیر کے نامور شاعر حضرت استاد عشق لہرؒ نے غازی صاحب کو ان الفاظ میں ہدیہ تبریک پیش کیا:

❑ "چودھویں صدی ایسے زمانے میں آپ نے محبت رسول ﷺ کا عملی ثبوت دے کر اپنے نام کو خوب روشن کیا ہے۔ وہ کوہ طور کا ایک مقدس ذرہ تھا جو عشق والوں کی آنکھ کا سرمہ بن گیا ہے"۔

شہید ناموس رسالت غازی علم الدین شہیدؒ کی ایک زندہ کرامت یہ بھی ہے کہ زندگی میں جب کوئی مشکل یا پریشانی لاحق ہو تو دو رکعت نفل ادا کریں۔ پھر ایک تسبیح درود شریف پڑھ کر غازی علم الدین شہیدؒ کی لازوال قربانی کا واسطہ دے کر حضوری کی کیفیت میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں تو آپ کی جائز حاجت ہر حال میں پوری ہوگی۔ عرصہ دراز سے یہ میرا اور میری فیملی کا آزمودہ نسخہ ہے۔ غازی صاحب کا مزارِ پاک لاہور کے مشہور قبرستان "میانی صاحب" نزد چوبرجی چوک لاہور میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔ 30 اور 31 اکتوبر کو آپؒ کی برسی بڑی شان و شوکت سے منائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو محبت رسول ﷺ کی سعادت نصیب فرمائے۔ آمین!

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں ان ﷺ کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا!

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس پر قربان ہو جانے والے خوش نصیبوں کا ایمان افروز تذکرہ

شہیدانِ ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم

محمد متین خالد

غازی علم دین شہیدؒ	غازی عبدالقیوم شہیدؒ	غازی حاجی محمد مانکؒ
غازی میاں محمد شہیدؒ	غازی عبداللہ شہیدؒ	غازی فاروق احمد
غازی احمد دین شہیدؒ	غازی زاہد حسینؒ	غازی عامر عبدالرحمٰن چیمہؒ
غازی مرید حسین شہیدؒ	غازی عبدالمنانؒ	غازی بابو معراج دین شہیدؒ
غازی عبدالرشید شہیدؒ	غازی ملک ممتاز حسین قادریؒ	غازی محمد صدیق شہیدؒ

اس کے علاوہ تحفظ ناموس رسالت ﷺ کے موضوع پر اور بہت سے دوسرے اہم مقالات

- ظلمت دہر میں "چراغ اسم محمد ﷺ" کی اجلی اور کومل لوؤں سے اجالا کرنے والے ضوریز وضیا بار ماہتابی و آفتابی کرداروں کا روشن تذکرہ
- تھانوں کی تنگ و تاریک حوالاتوں، پھانسی گھاٹوں کی بے نور فضاؤں اور جیلوں کی کال کوٹھڑیوں میں "آبروئے مازنام مصطفیٰ ﷺ است" کا ورد کرنے والے کفن بردوش مجاہدوں کی زندہ جاوید روداد اور انوکھے مشاہدات
- ایک ایسی کتاب جس کا ایک ایک لفظ ناموس رسالت ﷺ پر حملہ آور ہونے والے بدطینت انسان نما ابلیسوں کے ایوانوں کے لیے برق قضا کی حیثیت رکھتا ہے۔
- یہ کتاب محض ایک کتاب نہیں ..... خواجہ بطحا ﷺ کی حرمت پر کٹ مرنے والوں اور دشمنان رسالت مآب کے ناپاک وجود سے دھرتی کو پاک کرنے والی پاکیزہ ہستیوں کا مختصر مگر مبسوط انسائیکلوپیڈیا ہے۔

اپنی نوعیت کی منفرد کتاب جس کا مطالعہ آپ کے جذبہ ایمانی کو ایک نیا ولولہ عطا کرے گا

شہید ناموس رسالت ﷺ

شہیدان ناموس رسالت ﷺ نے جو کارنامے سرانجام دیئے ہیں، وہ رہتی دنیا تک فروزاں رہیں گے اور ان شہدا کو یاد کرنے والوں کے من میں غازیان کی یاد ہمیشہ للکتی لپکتی رہے گی۔ ان شہدا کو یاد کرنے والوں میں ایک تاب دار نام جناب محمد متین خالد کا ہے، جنہوں نے اس یاد میں تحقیق و تحریر سمیت تدوین کے میدان میں ایسی مشعلیں روشن کی ہیں جن کی روشنی چاند سورج کو بھی شرما رہی ہے۔ مجھے یاد ہے دو برس قبل جب میں نے شہدائے ناموس رسالت ﷺ پر قلم اٹھانے کا سوچا تو سب سے پہلا نام جو میرے سامنے آیا، وہ غازی علم دین شہیدؒ کا تھا، چونکہ میرا تعلق اسی شہر سے ہے جہاں غازی شہیدؒ نے اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کیے اور وہیں شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے تو لامحالہ مجھے غازی علم دین شہیدؒ نے سب سے پہلے متوجہ کیا۔

غازی علم دین شہیدؒ جن کے لیے یہ کتابچہ مرتب کیا جا رہا ہے، ایک ایسی شخصیت کے طور پر دنیا کے سامنے آئے جو بظاہر ایک عام انسان تھے لیکن اپنی ذات میں انتہائی خاص تھے اور یہ بات تمام غازیان کی ذات میں مشترک ہے کہ وہ بظاہر بہت عام انسان دکھائی دیتے ہیں، لیکن اپنے آپ میں بہت ہی خاص ہوتے ہیں۔ حیران کن طور پر تمام غازیان کے بارے مطالعہ کرنے سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ ان شہدا نے جذبات کی لہر میں نہیں بلکہ نہایت سوچ سمجھ کر اور عقل و دانائی کے عین مطابق گستاخان رسول ﷺ کو جہنم رسید کیا، جس میں ان کے بچنے کا ایک فیصد بھی چانس باقی نہیں رہتا۔ غازی علم دین شہیدؒ نے جس ملعون کو جہنم واصل کیا، اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی، یہ سب سوچا سمجھا منصوبہ تھا، جو بقائمی ہوش و حواس ترتیب دیا گیا، یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؒ جیسے نابغہء روزگار کو آپؒ پر رشک آتا تھا۔

غازی علم دین شہیدؒ کے حوالے سے جو کتابچہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ محمد متین خالد صاحب کے قلم کی کرامات میں سے ایسی ہی ایک کرامت ہے جو میرے جیسے احقر کو اس راستے پر چلنے کی توفیق دیتی ہے جو شہدائے ناموس رسالت ﷺ کا پسندیدہ ہے۔ ان شہدا سے محبت کا تقاضا ہے کہ انہوں نے جو عملی جہاد کیا، اسے قلمی جدوجہد سے زندہ رکھا جائے تاکہ بروز حشر آقا نامدار، حضور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے سامنے سرخرو ہو سکیں۔ محمد متین خالد قلمی جدوجہد کے اس قافلے کے اولین سالاروں میں شامل ہیں، جس میں شامل ہونے کے لیے مجھ ایسے اپنی جان، مال، اولاد، آبرو اور زندگی دینا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ اُمید ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد مجھ ایسے مزید اس قافلے میں شامل ہونے کی آرزو کریں گے۔

احمد خلیل جازم

امت گروپ آف پبلی کیشنز، کراچی، راولپنڈی